بیوی کی ضد

بلیغ الدّین جاوید

بیوِی کی ضِد

بلیغ الدّین جاوید

بیوی کی ضد

بچّو!

تُم نے بھی اکثر ضد کی ہو گی۔ ماں باپ کے سامنے بچّوں کی ضد مان لینے کے سوا کبھی کوئی اور صورت نہیں ہوتی کیونکہ ماں باپ بچّوں سے بہت پیار کرتے ہیں۔ اور اُن کی خواہشات کو مان لیتے ہیں۔

پھر بچّے تو ضِد کرتے ہی ہیں۔ اور اُن کی ضِد کبھی ایسی نہیں ہوتی جس سے دوسروں کو نقصان کا احتمال ہو۔ بلکہ بچّے اکثر مٹھائی، کپڑوں اور کھلونوں وغیرہ

کے لیے ضِد کرتے ہیں، جو ماں باپ انہیں لے دیتے ہیں۔

مگر بچّو! جب بڑے بھی ضِد کرنے لگیں تو اُن کی ضِد ماں باپ کے لیے نا قابلِ برداشت ہوتی ہے۔ اور ماں باپ کے علاوہ اگر یہ ضِد بیوی خاوند سے کرے تو وہ بیوی سے ضرور خفا رہنے لگتا ہے۔

اس لیے ضِد ہر حالت میں بُری چیز ہے۔ ضدّی کو کوئی بھی شخص پسند نہیں کرتا۔ بلکہ ضِد دوسرے لفظوں میں ایک بُرائی ہے۔

کہتے ہیں پُرانے زمانے میں ناروے میں ایک کسان اور اُس کی بیوی رہا کرتے تھے۔ اُن کے ہاں کوئی اولاد نہ تھی۔ کسان کی بیوی ضِدّی اور خود سر تھی۔ اور کبھی خاوند کی بات نہ مانتی تھی۔

ایک روز خاوند بازار سے اچھّا سا کپڑا لایا اور بولا۔ ”یہ لو اِس کپڑے سے میری قمیص تیّار کردو۔“

”نہیں تمہارے موزے پھٹے ہوئے ہیں۔ میں تو اِس سے تمہارے لیے موزے بناؤں گی۔ تا کہ بہت سے موزے تیّار ہو سکیں اور سردیاں آرام سے گزریں۔“ بیوی نے جواب دیا۔

خاوند نے کہا۔ ”اچھّی بیوی ذرا خیال کرو، ہر کپڑا موزوں کے لیے اچھّا نہیں۔ اِس سے قمیص تیّار کی جا سکتی ہے۔ آپ موزے تیّار نہ کریں۔“

مگر بیوی نے بس ایک ہی ضِد پکڑ لی کہ میں تو اِس سے موزے بناؤں گی۔ چنانچہ اُس نے سارے کپڑے کے موزے بنا دیئے اور بت چارہ خاوند کچھ کہہ بھی نہ سکا۔ وہ پھر بازار سے نیا پڑا لایا اور اُس نے بیوی سے کہا۔

”یہ لو اِس کا پاجامہ بنا دو؟“ دراصل وہ بیوی کی طبیعت سے واقف ہو گیا تھا۔ اور کپڑے سے قمیص تیّار کروانا چاہتا تھا۔ بیوی نے جب سُنا کہ خاوند پاجامہ بنوانا چاہتا ہے، تو اُس نے جواب دیا۔

”نہیں میں اِس کپڑے سے پاجامہ نہیں باؤں گی بلکہ قمیص تیّار کروں گی۔“

کسان تو یہی چاہتا تھا کہ قمیص تیّار کروائے۔ چنانچہ وہ خاموش ہو گیا۔ اور بیوی نے قمیص تیّار کر دی۔

اگر وہ گھر میں آتا اور بیوی سے کہتا۔

”ذرا ایک گلاس پانی تو پلا دو۔“

تو بیوی چیخ کر جواب دیتی۔ ”میں تمہاری نوکر نہیں ہوں جو یُوں پانی پلاؤں۔ تُم پانی پی پی کر بیمار مر جاؤ گے اور اپنے ساتھ مُجھے مُصیبت میں مُبتلا کر دو گے۔ یہ چائے کا وقت ہے۔ میں چائے تیّار کر کے لاتی ہوں۔“ چنانچہ وہ چائے تیّار کر کے اُسے پلاتی۔ اور جب کسان کہتا سردی بہت ہے اور میں تھکا ہوا ہوں ایک کپ چائے پلا دو۔“ تو کسان کی بیوی چلّاتی۔

”میں مشین نہیں ہوں کہ ہر وقت چولہا جلاتی رہوں۔ میں چائے تیّار نہیں کر

سکتی۔ یہ لو پانی پیو۔"

اور کسان بے چارے کو پانی پر گزارہ کرنا پڑتا، اِسی طرح اگر وہ بیوی سے کہتا کہ

"آج گھر میں گوشت پکے گا۔"

تو بیوی اُس کی خواہش رد کر دیتی اور چلّا اُٹھتی۔

"روز گوشت۔ نہیں۔ آج دال پکے گی۔"

اگر وہ کہتا۔

"آج گھر میں دال پکے گی۔" وہ چلّاتی

"نہیں سبزی پکے گی۔"

اِسی طرح بے چارے کسان کا جینا حرام ہو گیا تھا۔ وہ اب تک بیوی کے مزاج کو نہ سمجھ سکا تھا۔ گھر تو گھر محلے والے بھی اُس سے تنگ آ چکے تھے۔

مگر ایک واقعہ نے تو کسان کو بیوی سے سخت متنفّر کر دیا۔ ہوا یوں کہ کسان کو اطلاع ملی کہ اُس کا بھائی سخت بیمار ہے۔ اور بسترِ مرگ پر پڑا ہے اِس لیے اُس کی خبر گیری کو آجاؤ۔ کسان کو بے حد فکر ہوئی۔ اُس نے بیوی سے کہا۔

"میرا بھائی سخت بیمار ہے۔ اور میں بے حد پریشان اور فکر مند ہوں چلو اُس کی خبر گیری کے لیے دوسرے گاؤں میں چلیں، جو شمال کی جانب چار میل دور ہے۔"

کسان کی بیوی نے چیخ کر کہا۔ "تمہارا بھائی بھی کتنا احمق ہے۔ اِس موقع پر بیمار ہو گیا جبکہ میری بہن کے ہاں بچّہ پیدا ہوا ہے اور ہمارے لیے یہ بھی تو ضروری ہے کہ ہم مبارک باد کے لیے اُس کے ہاں جائیں۔ ورنہ وہ کتنا بُرا مانے گی۔"

"مگر بیگم۔" کسان نے کہا۔ "میرا بھائی اگر مر گیا تو کیا ہو گا۔ ہمیں جلد جا کر اُس کا علاج کرنا چاہیے۔"

"نہیں۔" بیوی نے کہا۔ "میں تمہیں نہیں جانے دوں گی۔ تمہیں بھی جنوب کی

جانب تین میل کے فاصلے پر میری بہن کے گھر جانا ہو گا ورنہ وہ بُرا مانے گی۔"

گو کسان جانا نہ چاہتا تھا، مگر بیوی نے اتنا شور مچایا کہ وہ مجبور ہو گیا۔ اور اُس نے بیوی کے ساتھ اِس شرط پر اُس کی بہن کے گھر جانا منظور کر لیا کہ اُسے مبارک دے کر فوراً شمال کی جانب بھائی کی خبر گیری کو جائیں گے۔

چنانچہ وہ بہن کے گھر جائیں گے۔ جہاں اُس کی بہن انہیں دیکھ کر بہت خوش ہوئی۔ شام کو جب انہوں نے واپس جانا چاہا۔ تو بہن نے کہا۔

"بھئی ابھی تو میں نہ جانے دوں گی۔ ایک آدھ دِن رُک کر چلے جانا۔"

اُس نے بہت کہا کہ اُس کا جانا ضروری ہے مگر بیوی کی ضِد کے سامنے وہ ہار مان گیا۔ اور ایک دِن کے لیے رُک گیا۔

پھر جب وہاں سے بھائی کے گاؤں پہنچا تو اُسے معلوم ہوا کہ اُس کا بھائی علاج نہ ہونے کی وجہ سے مر گیا ہے۔ اُس روز سے کسان بیوی سے نفرت کرنے لگا۔ اُس

کا خیال تھا کہ اگر اُس کی بیوی ضِد نہ کرتی اور اُسے وقت پہ گاؤں جانے دیتی تو اُس کا بھائی ضرور بچ جاتا۔ چنانچہ اُس نے بیوی سے بول چال کم کر دی۔ اور صرف ضرورت کے مطابق ہی بات کرنے لگا۔

وقت گزرتا رہا اور کسان گاؤں میں اُس آرام اور سکون سے محروم رہا جس کی اُسے تلاش تھی۔ جب فصل بونے کا موسم آیا تو اُس نے بڑی محنت سے زمین میں ہل چلایا اور ڈھیلے توڑتا رہا۔ پھر اُس نے کیاریاں بنائیں اور بیوی سے کہا۔

"اس بار میں کھیتوں میں رائی بوؤں گا۔ تا کہ اُسے فروخت کر کے بہت سارو پیہ کماؤں۔"

"کیا کہا رائی؟" بیوی نے چلّا کر جواب دیا۔ "جی میں رائی نہیں بونے دوں گی۔ میرے گھر میں سارے لحاف پھٹ گئے ہیں اور میں نے اِس سال نئے لحاف تیّار کروانے ہیں۔ اِس لیے اِس بار ہم رائی نہیں کپاس بوئیں گے۔"

"مگر یہ کپاس کا موسم نہیں ہے۔" کسان نے کہا۔ "کپاس کی فصل ہو تو جائے گی مگر بڑی خراب ہو گی۔"

"ہوتی رہے۔" بیوی نے کہا۔ "میں تو کپاس بوؤں گی۔ اگر تُم نے اپنی زمین میں رائی بوئی تو میں ساری فصل خراب کر دوں گی۔"

کسان بے چارہ سوچ میں پڑ گیا کہ اب کیا کرے۔ چنانچہ اُس نے بیوی کے سامنے ہتھیار ڈالتے ہوئے کہا۔

"اچھّا بھئی تُم جیتیں اور میں ہارا۔ ہم رائی نہیں بلکہ کپاس ہی بوئیں گے۔" چنانچہ انہوں نے زمین میں کپاس بو دی۔ کسان نے کپاس کی فصل کی خوب رکھوالی کی۔ اُسے وقت پر نلائی کیا اور پانی دیتا رہا۔ خُدا کا کرنا ایسا ہوا کہ فصل بڑی اچھّی ہو گئی۔ کسان بہت خوش ہوا۔ اور اس بات کا انتظار کرنے لگا۔ کہ فصل پک جائے تو کپاس چُن لے۔ چنانچہ جب فصل پک گئی تو اُس نے بیوی سے کہا۔

”ہم منگل کے روز فصل چُنیں گے۔“

بیوی نے جواب دیا۔

”نہیں پیر کے روز۔ اور اُسے چُنیں گے نہیں کاٹ لیں گے۔ گھر آ کر آرام سے چُن لیں گے۔“

کسان بولا۔ ”کبھی کِسی نے کپاس کی فصل بھی گھر آ کر چُنی ہے۔“

”ہم دوسروں کے ذمّہ دار نہیں ہیں۔“ بیوی نے جواب دیا۔ ”ہم اپنی مرضی کریں گے اور فصل کاٹ لیں گے۔“

کسان بے چارہ لاجواب ہو گیا۔ اُس نے بات بدلنے کے لیے کہا۔

”اچھّا جیسے تمہاری مرضی۔ فصل کو کاٹ ہی لیں گے۔ مگر میرا خیال ہے کہ پیر کو موسم بڑا خوشگوار رہے گا۔“ ضِدّی بیوی کو ہر بات میں اختلاف کرنا ہوتا تھا۔ چنانچہ اُس نے جواب دیا۔

”خوش گوار کیسے رہے گا پیر کو ضرور بارش ہو گی۔“

”تو کیا پیر کو بارش میں فصل کاٹیں گے۔“کسان نے حیران ہو کر پوچھا”کیا کسی نے بارش میں بھی فصل کاٹی ہے۔“

”ہاں ہاں۔“بیوی نے کہا۔”ہم بارش میں فصل کاٹ لیں گے۔ آخر ہمیں اور ہماری فصل کو کھا تھوڑا ہی جائے گی۔ ہم فصل ضرور کاٹ لیں گے۔“

کسان بے چارہ پھر لاجواب ہو گیا۔ وہ بڑا شریف آدمی تھا اور خواہ مخواہ لڑائی جھگڑا کرنا پسند نہ کرتا تھا۔ چنانچہ اُس نے کہا۔”تو فلاں فلاں شخص کو بُلا لیں تاکہ اُن کے ساتھ مل کر فصل کاٹ لی جائے۔“

بیوی نے کہا۔”فلاں فلاں کو کیوں بُلایا جائے۔ تمہاری مرضی سے میں کسی کو نہ آنے دوں گی۔ میں اپنی مرضی کے لوگوں سے فصل کٹواؤں گی۔ تُم کون ہوتے ہو مرضی کرنے والے۔“

کسان نے خاموشی ہی میں عافیت خیال کی۔ اُس نے کہا۔ بھئی فصل ہی کٹوانی ہے جسے چاہو بُلالو۔ ہمیں اِس سے کیا۔ تُم جانو اور تمہارا کام۔"

مگر بے چارہ تنگ آ چُکا تھا۔ ایک شام اُس نے دِل میں سوچا کہ میری بیوی کو شاید گھر سے باہر سیر کرنے کا موقع کم ملتا ہے جس وجہ سے وہ چڑ چِڑی اور ضِدّی ہو گئی ہے۔ اِس لیے زیادہ بہتر یہی ہے کہ اُسے روز سیر وغیرہ کرائی جائے۔ اور کھیتوں میں شام کی خُنک اور خوشگوار ہوا میں اپنی بات اچھّی طرح ذہن نشین کروائی جائے کہ ضِد کرنا اچھّی بات نہیں ہے۔ تُم اِس قدر ضِد مت کیا کرو۔ شاید وہ میری بات مان جائے۔

چنانچہ وہ گھر آیا۔ اُس نے بیوی سے کہا۔

"دیکھو موسم کتنا خوش گوار ہے۔"

"نہیں موسم خوش گوار نہیں ہے۔" بیوی نے جواب دیا۔ "تُم جھوٹ بولتے

ہو۔“

کسان مُسکرایا۔ ”اسے معلوم تھا کہ بیوی اختلاف تو ضرور کرے گی۔ چنانچہ اُس نے کہا۔ ”اِس خوش گوار موسم میں کیوں نہ کھیتوں کی سیر کی جائے۔“

”بیوی نے اِس پر بھی اختلاف کر دیا۔ حالانکہ وہ سیر کرنے کی بے حد شوقین تھی۔ اُس نے کہا۔

”کھیتوں کی سیر کیوں کی جائے، کیوں نہ دریا کی سیر کی جائے۔“

کسان نے جواب دیا۔ ”بھئی جب مطلب سیر کرنا ہی ہے تو کھیتوں کی سیر کی جائے یا دریا کی بات ایک ہی ہے۔ چلو تُم تیّار ہو جاؤ دریا پر چلیں گے۔“

چنانچہ بیری تیّار ہو گئی۔ دونوں میاں بیوی دریا پر سیر کرنے کے لیے گئے۔ جب وہ دریا کے پُل پر پہنچے تو خاوند نے بات شروع کرنے کے لیے کہا۔

”دیکھو نا فصل پیر کو کاٹ لیں گے۔ اُس کے لیے ہم درانتی وغیرہ تیز کر لیں۔“

بیوی ایک دم رُک گئی اور چلّا کر بولی۔

"کیا فصل درانتی سے کاٹو گے؟"

"ہاں ہاں۔" کسان نے حیران ہو کر کہا۔ "بھئی فصلیں درانتی ہی سے تو کاٹی جاتی ہیں۔ اور کس چیز سے فصل کاٹو گے۔"

"میں تو ہرگز ہرگز فصل کو درانتی سے نہ کاٹنے دوں گی۔" بیوی نے جواب دیا۔ "میں فصل کو قینچی سے کاٹوں گی اور تُم کو بھی فصل قینچی سے کاٹنی ہو گی۔" "قینچی سے؟" کسان نے حیرت سے کہا۔ "کبھی کسی شخص نے قینچی سے بھی فصل کاٹی ہے؟ تُم ہر بات میں مُجھ سے اختلاف کرتی ہو۔ فصل بہر حال فصل درانتی سے کاٹی جائے گی۔ درانتی سے۔ سُن لیا۔ درانتی سے۔"

کسان نے بار بار کہا۔ اُسے بے حد غصّہ آ گیا تھا۔

"نہیں نہیں۔ قینچی سے قینچی سے۔" کسان کی بیوی نے بھی غصّے سے مُنہ میں

جھاگ بھر کر جواب دیا۔

"درانتی سے۔" وہ بولا۔

"قینچی سے۔" بیوی نے اُچھل کر جواب دیا۔

"درانتی سے۔ درانتی سے۔" کسان نے بھی اُسی انداز میں کہا۔

"قینچی سے۔" کسان کی بیوی نے غصّے میں آپے سے باہر ہو کر جواب دیا۔

اور جُو نہی وہ اُچھلی اُس کا پاؤں اُکھڑ گیا۔ اور دھڑام سے دریا میں گر گئی۔

کسان تیرنا نہیں جانتا تھا۔ دوسرے وہ غصّے میں تھا۔ اُس نے اُسے بچانے کی کوئی کوشش نہ کی۔ اچانک ڈُبکیاں کھاتی ہوئی اُس کی بیوی پانی کی سطح پر اُبھری اور چِلاّئی۔

"قینچی سے۔"

کسان نے کہا۔ ”نہیں درانتی سے۔“

اُس کی بیوی نے پھر غوطہ کھایا اور جب وہ سطح پر اُبھری تو اُس نے پھر چلّا کر کہا۔

”قینچی سے۔“

کسان نے بھی چلّا کر کہا۔ ”نہیں درانتی سے۔“

وہ ڈُبکیاں کھاتی رہی۔ جب وہ سطح پر اُبھرتی وہ زور سے چلّا کر کہتی۔

”قینچی سے۔“

جس کے جواب میں کسان بھی چلّا کر جواب دیتا۔

”نہیں درانتی سے۔“

آخر میں بیوی بے جان سی ہو گئی۔ جب وہ پھر سطح پر اُبھری تو وہ بول بھی نہ سکتی تھی۔ چنانچہ اُس نے غصّے کے عالم میں دونوں انگلیوں کو ملا کر اشارہ سے کہا۔

”قینچی سے۔“

کسان پورے زور سے چلّایا۔

”نہیں درانتی سے۔“ پھر اُس کی بیوی سطح پر نہ اُبھری اور دریا میں ڈوب کر مر گئی۔

کسان نے گاؤں والوں کو ساری بات کی اطلاع دی۔ سارے ہی گاؤں والے اُس سے تنگ آ گئے تھے۔ اِس لیے کسی کو بھی افسوس نہ ہوا۔ مگر گاؤں کے کُچھ تیراک نوجوانوں نے اُس کی لاش تلاش کرنے کے لیے دریا میں چھلانگ لگا دی۔ اور دریا کی تہہ میں اُسے تلاش کرنے لگے۔

بہت زیادہ تلاش کے بعد بھی جب دریا کے بہاؤ کے رُخ پر لاش نہ ملی، تو ایک نوجوان نے کہا۔

”ہم نے دریا کے بہاؤ کے رُخ پر اُس کی لاش کو بے حد تلاش کیا مگر افسوس لاش

نہیں ملی۔ اور اتنی جلدی زیادہ دور جا بھی نہیں سکتی۔ ہم نے دُور دُور تک تلاش کر لیا ہے۔ آخر وہ کہاں گئی۔ سخت حیرت ہے۔"

کسان نے کہا۔" میں بتاتا ہوں۔ وہ دریا کے مخالف رُخ پہ بہہ گئی ہو گی۔"

"اُلٹے رُخ پر۔" سب نے کہا۔" یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ آج تک کوئی بھی چیز دریا کے اُلٹے رُخ پر نہیں بہی۔ ہم بے وقوف نہیں ہیں جو اُسے اُلٹے رُخ تلاش کریں۔"

"جاؤ۔" کسان نے جواب دیا۔"وہ اتنی ضِدّی تھی کہ ہر بات اُلٹ کیا کرتی تھی۔ یقیناً وہ دریا کے اُلٹے رُخ بہہ گئی ہو گی۔ تُم آزما کر دیکھ لو۔"

غوطہ خوروں نے دریا کے اُلٹے رُخ پر اُسے تلاش کیا اور وہ یہ دیکھ کر حیران رہ گئے کہ لاش واقعی اُلٹے رُخ بہہ کر دُور چلی گئی تھی۔

اِس طرح اُس ضِدّی عورت نے مر کر بھی ضِد کو نہ چھوڑا۔

شوربے کا پتھّر

عرصہ گذرا ایک سپاہی ایک جنگل میں سفر کر رہا تھا۔ اتّفاق سے اُس کے پاس کھانے پینے کا کوئی سامان نہ تھا۔ یوں بھی مُلک کے ایک خوش حال نہ تھے۔ اِس وجہ سے کوئی مہمان نوازی بھی نہ کرتا تھا۔ بے چارہ کئی کئی روز بھوکا رہتا۔ اور پھر کہیں جا کر اُسے کسی خُدا ترس شخص کی وساطت سے کھانا نصیب ہوتا۔

ایک روز جبکہ وہ کئی روز کا بھوکا تھا۔ اُس نے ایک مکان پر دستک دی۔ مالک مکان نے گھر سے باہر نکل کر کہا۔ ”کیا بات ہے؟“

”میں تین روز سے بھوکا ہوں۔“ سپاہی نے جواب دیا۔ ”اور آپ سے کھانے کا کُچھ سامان مانگنے کے لیے رُکا ہوں۔ میں ایک سپاہی ہوں۔ واپسی پر جب میرا اِدھر سے گزر ہو گا تو آپ کا قرض چُکا دوں گا۔ آپ میری کُچھ امداد کریں۔“

کسان نے جواب دیا۔ ”میاں سپاہی جاؤ اور بادشاہ سے کُچھ مانگو، ہم غریب لوگ ہیں۔ تمہیں کہاں سے کُچھ دے سکتے ہیں۔ ہمارے تو اپنے پاس کُچھ کھانے کو نہیں

ہے۔ جوں تُوں کر کے گُزر اوقات کر رہے ہیں۔ کسی اور کی امداد کیا کریں؟"

یہ کہہ کر اُس نے گھر کا دروازہ بند کر لیا۔ اور سپاہی بے چارہ راستے پر چل پڑا۔ وہ بے حد رنجیدہ ہوا کہ لوگ خُدا ترسی نہیں کرتے۔

راستے میں اُسے ایک مکان ملا۔ اُس کے صحن میں چند عورتیں بیٹھی چرخہ کاٹ رہی تھیں۔ اور ایک دوسری سے ہنس ہنس کر باتیں کر رہی تھیں۔ سپاہی نے رُک کر کہا۔

"بہنوں۔ میں کئی روز سے بھوکا ہوں۔ بادشاہ کا سپاہی ہوں۔ سردی کے اِس موسم میں میرے پاس جو کُچھ تھا ختم ہو چکا ہے۔ آپ مُجھے ذرا سا کھانا دے دیں۔ میں بھیک نہیں مانگتا۔ واپسی پر آپ کا قرضہ چکا دوں گا۔"

ایک عورت نے کہا۔ "کتنا ہٹّا کٹّا ہے اور بھیک مانگ رہا ہے۔" دوسری بولی۔ "دھوکا دیتا ہے۔ مُجھے تو کوئی خراب آدمی معلوم ہوتا ہے۔"

تیسری نے کہا۔ ”اِسے یہاں سے دھکّے دے کر نکال دینا چاہیے۔“

جب سپاہی نے اپنی یہاں بھی دال گلتی نہ دیکھی تو بے حد اُداس ہوا۔ اُس نے سوچا سیدھے ہاتھوں سے تو کوئی بھی کُچھ کھانے کو دینے سے رہا۔ بہتر ہے کہ بھوکے مرنے کی بجائے دوسروں سے دھوکہ کیا جائے۔ اور خود کو بچایا جائے۔ چنانچہ اُس نے دوسروں سے دھوکہ کرنے کا فیصلہ کر لیا۔

اُس نے سڑک پر پڑا ہوا ایک پتھّر اُٹھایا اور اپنی جیب میں رکھ لیا۔ پھر اُس نے ایک مکان پر دستک دی۔ مکان کی مالکن باہر نکلی۔ اُس نے پوچھا۔ ”کیا بات ہے؟“

”بھوکا ہوں۔ کُچھ کھانے کو چاہیئے۔“ سپاہی نے جواب دیا۔

”ہمارے پاس خود کُچھ نہیں ہے۔“ اُس نے جواب دیا۔ ”ہم تمہیں کہاں سے دیں۔ کسی اور گھر کا راستہ دیکھو۔“

”اچھّا۔“ سپاہی نے کہا۔ ”تو اِس کا مطلب ہے تُم لوگ بھی بھوکے ہو۔ میں تُم سب کو مزے دار شوربا پلاتا ہوں، میرے پاس شوربے کا ایک پتھّر ہے، جس سے خود بخود شوربہ بن جاتا ہے۔“

”خود بخود شوربہ بن جاتا ہے؟“ اس نے اور دوسری عورتوں نے حیرانی سے کہا۔

”ہاں ہاں۔“ سپاہی نے کہا۔ ”اِسے پانی میں ڈال دو۔ خود بخود شوربہ بن جاتا ہے۔ مزے دار، خوش بُودار۔“

”ایک عورت نے کہا۔ ”یہ بات ہے۔ دیکھوں تو وہ پتھّر۔“

سپاہی نے اُسے پتھّر دِکھایا اور بولا۔

”آپ کے گھر میں دیگ تو ہو گی۔“

”ہاں ہاں۔“ عورت نے جلدی سے کہا۔ ”ہمارے گھر میں دیگ موجود ہے۔ بڑی سی دیگ۔“

”تو لے آؤ تا کہ شوربہ بنائیں اور سب پئیں۔“ سپاہی نے کہا۔

مالکن نے ایک دیگ نکالی اور سپاہی کو دی۔ اب سپاہی نے جلدی جلدی ایک چولھا تیّار کیا اور دیگ کو اُس پر چڑھا دیا۔ پھر اُس نے کہا۔

”اِس میں بہت سا پانی ڈال دو۔“ عورت نے اُس میں بہت سا پانی ڈالی دیا۔ ساری عورتیں دیگ کے گرد جمع ہو گئیں۔ سپاہی نے اپنا پتھّر دیگ میں ڈال دیا اور بولا۔

”جب پانی پکنے لگے گا، خود بخود شوربہ تیّار ہو جائے گا۔ اور سب مزے سے پئیں گے۔“ پھر اُس نے کہا۔

”آپ کے پاس نمک تو ہو گا۔ نمک سے شورہ ذرا ذائقے دار بنے گا۔“

”ہاں ہاں۔“ ایک عورت بولی۔ ”ہمارے پاس نمک ہے۔“ اور اُس نے بہت سا نمک لا کر سپاہی کو دیا۔ سپاہی نے مُٹھّی بھر کر دیگ میں ڈال دیا۔ اور پھر سب کو اپنی جنگ سے واقعات سُنانے لگا۔ مگر اُن سب کی توجّہ دیگ کی طرف تھی جس

میں شوربہ پک رہا تھا۔ اور حیرانی والی باری تھی کہ شوربہ بھی پتھّر کا۔ ایک دم سپاہی کی نظر چارپائی کے نیچے پڑی ہوئی گاجروں پر پڑی۔ اُس نے آہستہ سے کہا۔

"وہ گاجریں کیسی ہیں؟"

"اپنی ہی ہیں۔" عورت نے جواب دیا۔

"تو لاؤ۔ ان کو بھی دیگ میں ڈال دیں۔ شوربہ زیادہ مزیدار ہو گا۔"

عورتوں نے جلدی جلدی وہ گاجریں صاف کیں اور ان سب کو دیگ میں ڈال دیا، اور پھر وہ سب انتظار کرنے لگے۔ سپاہی نے انہیں بادشاہ کے دربار کا ایک واقعہ سُنایا۔ کہ کیسے اِس پتھّر نے سارے دربار کی خاطر کی تھی۔ پھر اُس نے کہا۔

"شوربے کی لوازمات میں سے ایک آلو بھی ہیں، اگر مل جائے تو کیا ہی بات تھی۔"

"آلو۔" مالک مکان کی لڑکی بولی۔ "ہمارے کھیت میں بہت آلو ہیں۔ ابھی ٹھہرو

میں جا کر لاتی ہوں۔"

چنانچہ وہ بھاگی بھاگی گئی اور اور بہت سارے آلو لے آئی۔ انہوں نے آلو صاف کیئے انہیں کاٹا اور دیگ میں ڈال دیا۔

پھر وہ سب باتیں کرنے لگے۔ سپاہی نے کہا۔

"ایک بار کیا ہوا کہ پوری فوج کے کھانے کے لیے کُچھ نہ تھا۔ صرف چند گو بھی کے پھُول تھے۔ اور اِس سے میں نے ساری فوج کو جی بھر کر کھانا کھلا دیا۔"

"وہ کیسے۔" ایک عورت نے پوچھا۔

"وہ یوں کہ میں نے سپہ سالار سے کہا کہ وہ ایک دیگ چڑھا دے اور اس میں گو بھی ڈال دے۔ اُس نے ایسا ہی کیا۔ میں نے دیگ میں اپنا پتھّر ڈال دیا۔ کُچھ دیر بعد اُس سے لذیذ شوربہ تیّار ہو گیا۔" اور پوری فوج نے جی بھر کر کھالیا۔"

"تو کیا اِس میں گو بھی ڈالنے سے اِس کا ذائقہ اور لذیذ ہو جائے گا؟" مالکن نے

پوچھا۔

"یقیناً۔" سپاہی نے جواب دیا۔ "گوبھی سے تو جیسا ذائقہ بنے کا اور کسی چیز سے مُمکن ہی نہیں۔"

"تو گوبھی بھی ڈالے دیتے ہیں۔" اُس نے کہا۔ "ہمارے کھیت میں بہت گوبھی آئی ہوئی ہے۔" پھر اُس نے اپنی لڑکی سے کہا۔ "جاؤ اور کھیت سے گوبھی کے دو بڑے بڑے پھول لے آؤ۔"

لڑکی سرپٹ دوڑتی ہوئی کھیت میں گئی اور بڑے بڑے دو گوبھی کے پھول لے آئی۔ پھر اُس نے وہ پھُول سپاہی کو دیے جس نے پھولوں کو کاٹ کر دیگ میں ڈال دیا۔

مالکن نے پوچھا۔ "اب یہ شوربہ کتنی دیر بعد تیّار ہو جائے گا؟"

"بس آدھے گھنٹے بعد۔ اِس دوران میں تمھیں ایک واقعہ سُناتا ہوں۔"

"ہاں۔ ہاں۔ سناؤ تا کہ ہماری بے تابی کا وقت کٹ جائے۔" ایک عورت نے جواب دیا۔ "ہمیں یہ شوربہ تیّار ہونے کا کس قدر اِنتظار ہے۔ اُس کا اندازہ آپ لوگ نہیں لگا سکتے۔"

"ہاں ہاں۔ میں ایک مزے دار واقعہ سُناتا ہوں۔ جب ہم ایک سو سپاہی جنگل میں سفر کر رہے تھے۔ ہم بے حد بھوکے تھے۔ ہم نے جنگل سے ایک پرندہ شکار کیا، وہ پرندہ اتنا چھوٹا تھا کہ ایک سو آدمیوں کا تو کیا ایک کا بھی پیٹ نہ بھر سکتا تھا۔ چنانچہ میرے ساتھیوں نے کہا۔ یہ پرندہ پھینک دو اور کوئی اور کھانے پینے کا انتظام کرو۔ میں نے کہا۔ نہیں میں اِس پرندے سے اِس قدر شوربا پکا لوں گا کہ آپ پیٹ بھر کہ پی سکیں گے۔

ہمارے پاس ایک برتن تھا۔ ہم نے اُسے آگ پر رکھ دیا اور اُس میں پانی ڈال دیا۔ پھر وہ پرندہ صاف کر کے پانی میں ڈالا۔ اور میں نے شوربے کا پتھر پانی میں ڈال کر مُنہ بند کر دیا۔"

”پھر؟“عورتوں نے بے تابی سے پوچھا۔

”پھر۔“ سپاہی نے کہا۔ ”اُس سے اِس قدر شوربہ تیّار ہو گیا۔ کہ ہم سب نے جی بھر کر اُسے پیا۔ اور دو دن تک سارے سپاہی اُسے پیتے اور عیش کرتے رہے۔ اور وہ پھر بھی ختم نہ ہوا۔“ ”تو یہ بات ہے۔“ ایک عورت نے کہا۔

”ہاں۔“ سپاہی نے کہا۔ ”دراصل شوربے میں اگر گوشت کا جُز بھی شامل ہو جائے کہ اُس کی خوشبُو اور ذائقہ بدل جاتا ہے اور آپ تو جانتی ہیں کہ گوشت یوں بھی کھانوں کو لذیذ بناتا ہے۔ بہر حال کوئی مضائقہ نہیں۔ پتھّر کا شوربہ تو بہر حال پیا ہی جا سکتا ہے نا۔ اب چند لمحوں بعد پتھّر کا شوربہ تیّار ہو جائے گا۔“

ابھی وہ باتیں کر ہی رہے تھے کہ مالک مکان کا لڑکا گھر میں داخل ہوا۔ وہ جنگل میں شکار کھیلنے گیا تھا۔ مالکن نے پوچھا۔

”بیٹا کوئی شکار لائے؟“

”ہاں۔“ لڑکے نے جواب دیا۔ ”مگر یہ سب کیا ہو رہا ہے۔ آپ لوگ کِس چیز کو اتنے اہتمام سے پکار ہے ہیں؟“

ماں نے کہا۔ ”بیٹے یہ سپاہی شوربے کا پتھّر لایا ہے۔ اور اِس سے ہم شوربہ تیّار کر رہے ہیں۔“

سپاہی نے بات بگڑتی دیکھی تو خود بول پڑا۔

”کوئی بات نہیں۔ آپ بھی دیکھ لیجئے۔ یہ خاص قسم کا پتھّر ہے۔ اس سے ابھی شوربہ بن جائے گا۔ آپ خود پی کر دیکھ لیں گے۔ مگر آپ کیا شکار لائے ہیں۔“

”میں دو خرگوش شکار کر کے لایا ہوں۔“ لڑکے نے جواب دیا۔

”تو لاؤ۔ اُن کو بھی اِس شوربے میں ڈال دو۔ تاکہ اِس میں تمہارا حصّہ بھی شامل ہو جائے اور دوسرے یہ کہ اِس کا ذائقہ بھی گوشت سے لذیذ ہو جائے گا۔“ سپاہی نے کہا۔

”ہاں ہاں۔ کیوں نہیں؟“ لڑکے نے جواب دیا۔ ”میں اپنے دونوں خرگوش دینے کے لیے تیّار ہوں۔“

چنانچہ انہوں نے جلدی جلدی خرگوشوں کی کھال اُتاری۔ اُن کو ٹکڑے ٹکڑے کیا اور دیگ میں ڈال دیا۔ پھر سپاہی نے کہا۔

”اب سب لوازمات پورے ہو گئے ہیں۔ بس شوربہ پکا ہی چاہتا ہے۔ کُچھ انتظار اور کرو۔“

انہوں نے آگ تیز کر دی اور دیگ کا مُنہ مضبوطی سے بند کر دیا۔

کُچھ دیر بعد انہوں نے دیگ اُتار لی اور جب اُسے کھولا تو دیگ میں مزے دار اور خوشبودار شوربہ بھرا ہوا تھا۔

”کمال ہے بھئی۔۔۔“ عورت نے کہا۔ لڑکا اور باقی سب بھی حیران رہ گئے۔

پل بھر میں یہ خبر گاؤں بھر میں پھیل گئی کہ ایک سپاہی کسان کے گھر آیا ہے،

جِس نے پتھّر سے شوربا تیّار کیا ہے جو حد مزے دار اور خوشبُو دار ہے۔

لوگ جوق در جوق کسان کے گھر میں جمع ہونے لگے اور انہوں نے تھوڑا تھوڑا

شوربہ پیا۔

سپاہی نے خوب پیٹ بھر کر شوربہ پیا، آلو گو بھی اور گوشت کھایا اور پھر اُس نے اپنا پتھّر دیگ سے نکال لیا۔ اور جانے کی تیّاری کرنے لگا۔ اچانک اُس نے رُک کر کہا۔

''میں آپ کا بے حد شکر گزار ہوں کہ آپ نے مُجھے اتنا مزیدار شوربہ پلایا۔''

''آپ کیوں شرمندہ کرتے ہیں؟'' کسان کی بیوی نے جواب دیا۔ ''آپ اگر پتھّر نہ ڈالتے تو ہم لوگ اتنا مزیدار شوربا کیسے پی سکتے تھے۔ آپ کا شکریہ ہمیں ادا کرنا چاہیے۔''

''بہر حال اب، میں جا رہا ہوں۔'' سپاہی نے جواب دیا۔ ''اور یہ لو پتھّر۔ اِسے آپ رکھے لیں۔''

کسان کی بیوی نے بہت انکار کیا۔ مگر سپاہی نے مجبور کیا کہ وہ پتھّر قبول کرلے۔

چنانچہ کسان کی بیوی نے پتھّر لے لیا۔ سپاہی نے کہا۔ ”یہ پتھّر اتنا قیمتی نہیں ہے۔ اِس کا طریقہ آپ کو معلوم ہو گیا ہے۔ جب بھی ضرورت پڑے اِس طریقہ سے شوربہ بنا لیجئے۔“

یہ کہہ کر وہ چلا گیا۔ اور راستے میں اُس نے اس جیسا ایک اور پتھّر اُٹھایا اور جیب میں رکھ لیا تا کہ راستے میں جب بھوک زیادہ ستائے تو پھر کام آ سکے۔

کیلے کا درخت

بچّو!

تُم نے بندر بانٹ کا لفظ تو سُنا ہو گا۔ اور یہ بھی شاید تمہیں معلوم ہو کہ اِس کا کیا مطلب ہے۔ اور اگر نہیں معلوم تو ہم بتلائے دیتے ہیں۔

غیر منصفانہ تقسیم کو بندر بانٹ کہا جاتا ہے۔ جِس میں ایک فریق بے شمار حصّہ حاصل کرے اور دوسرا فریق کُچھ بھی حامل نہ کر سکے۔

اِس ضمن میں تُم نے یقیناًوہ کہاوت بھی سُنی ہو گی جو اِس ضرب المثل کا محرک بنی
وہ کہاوت بلی اور بندر کے بارے میں ہے۔ جہاں بِلّیوں کو روٹیوں کا ایک ٹکڑا ملا
تھا۔ اور انہوں نے بندر سے انصاف کرانے کے لیے اسے یہ ٹکڑا دو حصّوں میں
تقسیم کرنے کو کہا۔ بندر پھر سے ترازو کا پلڑا جھکتا تھوڑا سا کر مُنہ میں توڑ کر ڈال
لیتا۔ آہستہ آہستہ ساری روٹی ختم ہو گئی اور بے جاری بلّیاں بندر کا مُنہ دیکھتی رہ
گئیں۔

مگر بچّو فلپائن کی یہ کہانی ہندوستان کے بندر اور بِلّیوں کی کہانی سے مُختلف ہے۔ گو
اِس میں بندر کو بے وقوف اور ناانصاف بتایا گیا ہے۔

یہ ایک بندر اور کچھوے کی کہانی ہے جو ایک دریا کے کنارے کھڑے تھے۔ ہوا
یوں کہ کچھوا دریا کے ٹھنڈے ٹھنڈے پانی سے نکل کر ساحل کے ریت پر
گھومنے کے لیے نکلا ہی تھا کہ اُسے ایک بندر مل گیا۔ وہ بھی شاید دریا سے پانی پینے
کے لیے آیا تھا۔ کچھوے کو معلوم تھا کہ دریا میں سیلاب آیا ہوا ہے اور اِس

سیلاب میں ایک کیلے کا درخت بہتا ہوا آرہا ہے۔ چنانچہ کچھوے نے بندر کو بُلایا اور کہا۔

”میاں بندر، دریا میں کُچھ ہی دور ایک بڑا کیلے کا سر سبز درخت بہتا ہوا آ رہا ہے۔ اگر تُم میری مدد کرو، تو ہم اُسے دریا سے باہر نکال لیں گے اور پھر کسی دوسری جگہ بو کر اُس کا پھل کھایا کریں گے۔ بس مزا آ جائے گا۔“

بندر رضامند ہو گیا۔ اور دونوں دریا کے کنارے بیٹھ کر درخت کا انتظار کرنے لگے۔

آہستہ آہستہ وہ درخت قریب آتا گیا۔ اور جُونہی وہ بندر اور کچھوے کے پاس سے پانی کے بہاؤ کے ساتھ بہتا ہوا گزرنے لگا تو انہوں نے اُسے دریا سے باہر نکال لیا۔ دونوں اِس محنت میں بہت تھک گئے چنانچہ جُونہی وہ درخت زمین پر رکھا وہ خود ذرا سستانے کے لیے ایک درخت کے نیچے بیٹھ گئے۔ بندر نے کیلے کے درخت پر نظریں جما کر کہا۔

”میاں کچھوے میں اِس درخت میں شراکت برداشت نہیں کر سکتا۔ کیوں نہ ہم اِسے آدھا آدھا بانٹ لیں۔ تاکہ کوئی جھگڑا ہی پیدا نہ ہو۔ میں اپنا حصّہ لے

جاؤں تُم اپنا حصّہ لے جاؤ۔" کچھوا عقل مند تھا۔ اُس نے جواب دیا۔

"میاں بندر تم درست کہتے ہو۔ مگر جانتے ہو کہ اِسے کاٹنے سے یہ برباد ہو جائے گا اور کسی کے کام نہیں آئے گا۔ اِس سے بہتر ہے کہ اِسے ہم مل کر بو دیں اور جب اِسے پھل لگے تو دونوں پیٹ بھر کر کھائیں۔"

"نہیں۔" بندر نے جواب دیا۔ "مُجھے یہ شرط منظور نہیں۔ میں ایک حقیر کے ساتھ شراکت نہیں کر سکتا۔ میں اِسے تقسیم کروں گا اور اگر تمہیں یہ منظور نہ ہو تو میں اِسے دوبارہ دریابُرد کر رہا ہوں۔ بتاؤ اب کیا کہتے ہو؟"

کچھوے کو معلوم تھا کہ بندر بے وقوف اور ضِدّی ہے۔ بے چارے کے پاس اِس کے سوا کوئی چارہ نہ تھا کہ اُس کی بات مان لے، چنانچہ اس نے کہا۔

"اچھا بھائی بندر، جو تمہاری مرضی۔"

بندر اُچھلتا کودتا گیا اور کسی کسان کی ایک درانتی اُٹھا لایا۔ اُس نے درخت کو ناپ

کر درمیان سے دو حصّوں سے تقسیم کر دیا۔ تب کچھوے نے کہا۔

"اچھا میاں بندر، اب بتاؤ تُم درخت کا کون سا حصّہ پسند کرو گے ؟"

بندر نے دیکھا کہ درخت کا اوپر کا حصّہ زیادہ خوب صورت ہے۔ اُس پر ہرے بھرے خوب صورت پتّے لگے ہوئے ہیں جبکہ نِچلا حصّہ ناکارہ سے تنے پر مُشتمل ہے۔ اِس لیے اُس نے اوپر والا حصّہ لینے کا فیصلہ کیا۔

"میں اوپر والا حصّہ لوں گا۔"

کچھوے نے یہ بات منظور کر لی اور بندر کو اوپر والا حصّہ اُسے دے دیا۔ کچھوا نیچے والا حصّہ لے کر چلا گیا۔ اور بندر اپنا اوپر والا حصّہ لے گیا۔ دونوں نے اپنے اپنے حصّوں کو لے جا کر اپنی زمین میں بو دیا۔ اور اُس کی نگرانی کرنے لگے۔

مگر بچّو تمہیں معلوم ہے نا کہ جڑ تو درخت کے نِچلے حصّے میں ہوتی ہے۔ اور وہی زمین میں لگائی جاتی ہے۔ چنانچہ نیچے والا حصّہ جو کچھوے کے حصّے میں آیا تھا زمین

سے پھُوٹ نکلا اور اُگ آیا۔ جبکہ اُوپر والا حصّہ جو کہ بندر لے گیا تھا خُشک ہو گیا۔
بندر کو بڑا افسوس ہوا مگر وہ کیا کر سکتا تھا۔ اُس نے تو خود اوپر والا حصّہ پسند کیا تھا۔
سارا قصور خود اُس کا تھا۔ چنانچہ وہ خاموش ہو گیا۔

کچھوا اپنے حصّے کو پانی دیتا رہا۔ اور بڑی رکھوالی کرتا رہا۔ جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ اُس کا
حصّہ پھل دینے لگا۔ جب اُس کے درخت میں پہلی بار پھل لگا تو کچھوا بہت خوش
ہوا۔ اور درخت کی زیادہ نگرانی کرنے لگا۔ دِن رات کی نگرانی اور خبر گیری کا یہ
نتیجہ نکلا کہ پھل پک گیا، اب کچھوے نے اِرادہ کیا کہ وہ پھل کھائے اور اپنی
محنت کا صلہ پائے۔

مگر کچھوا اتنا چھوٹا سا جانور تھا کہ وہ اِتنے بُلند کیلے کے درخت تک نہ پہنچ سکتا تھا۔
چنانچہ وہ سوچنے لگا کہ درخت سے کیلے کیسے اُتارے۔ مگر کوئی ترکیب اُس کے
ذہن میں نہ آئی چنانچہ مجبور ہو کر کچھوے نے بندر سے امداد لینے کا فیصلہ کیا۔ وہ
بندر کے پاس گیا اور اُسے بتایا کہ اُس کے کیلے کے درخت کو پہلی بار پھل لگا ہے۔

مگر وہ اِتنا چھوٹا ہے کہ درخت پر سے پھل نہیں اُتار سکتا۔ اِس لیے تم میری مدد کرو۔

بندر نے کہا۔ ”بھئی کچھوے میں تو ہر کام کا معاوضہ لیتا ہوں۔ اگر تم نِصف پھل مُجھے دے دو تو مین تمہیں پھل اُتار دوں گا۔

کچھوے بے چارے نے اتنی محنت کی تھی کہ وہ مفت میں نصف پھل دینا نہ چاہتا تھا۔ مگر آخر وہ کیا کرتا۔ بندر کسی اور شرط یہ پھل اُتارنے کے لیے تیّار نہ تھا۔ مجبور ہو کر کچھوے نے کہا۔

”اچھا بھئی مُجھے یہ شرط منظور ہے۔ چلو میرے ساتھ اور درخت سے پھل اُتار دو۔“

بندر اور کچھوا اُس جگہ آئے جہاں دریا کے کنارے کچھوے نے وہ درخت لگایا تھا۔ بندر نے اچھّی طرح درخت کا جائزہ لیا۔ درخت پر پکے ہوئے کیلے لگے

ہوئے تھے۔ بندر کے مُنہ میں پانی بھر آیا۔ وہ اُچھل کے درخت پر چڑھ گیا اور کیلے اُتار اُتار کر کھانے لگا۔ کچھوے نے جب اُسے کیلے کھاتے ہوئے دیکھا تو کہا۔

"میاں بندر کیلے نیچے بھی پھینکو نا۔ تا کہ میں بھی اپنی محنت کا ثمر کھاؤں۔"

مگر بندر نے جواب دیا۔ "تم کیلے کھا کر کیا کرو گے۔ تم اتنے حقیر سے حیوان ہو۔ تمہیں کیلوں کی کیا ضرورت ہے۔ یہ تو بندروں کے کھانے کا میوہ ہے۔ یہ لو چھلکے کھاؤ۔"

اور اُس نے کیلوں کے چھلکے کچھوے کی طرف پھینکنا شروع کر دیے مگر کچھوا چھلکو کو کیا کرتا۔ یہ دیکھ کر اُس کے تو تن بدِن میں آگ لگ گئی۔ کئی ماہ بے چارے نے دِن رات درخت کی نگرانی کی تھی اور اُسے بڑی مُشکل سے پانی وغیرہ دیتا رہا تھا۔ اب اُس کی محنت اتنی آسانی سے بندر اُڑا لے گیا تھا۔ چنانچہ اُس نے بندر سے کہا۔

"دیکھو میاں بندر، اگر تم نے یہ ناانصافی ختم نہ کی تو میں تُم سے ضرور بدلہ لوں

گا۔“

”تُم مُجھ سے کیا بدلہ لے سکتے ہو۔“ بندر نے جواب دیا۔ ”تم اتنے حقیر کچھوے ہو۔ اور خود اپنے درخت کا پھل بھی نہیں اُتار سکتے۔ اگر چھلکے کھا سکتے ہو تو کھاؤ ورنہ یہاں سے بھاگ جاؤ۔“

جب کچھوے نے اپنا ہر حربہ ناکام ہوتے دیکھا تو اُس نے واقعی بدلہ لینے کا فیصلہ کر لیا۔ چنانچہ وہ اِدھر اُدھر سے بے شمار کانٹے دار جھاڑیاں جو سوکھی ہوئی اِرد گرد بکھری ہوئی پڑی تھیں اُٹھا لایا۔ اور درخت کے ارد گرد پھیلا دیں، بندر اپنے کام میں اتنا مصروف تھا کہ اُسے معلوم بھی نہ ہوا کہ کچھوا کیا کر رہا ہے۔ جب درخت پر سبھی پھل ختم ہو گئے تو اُس نے کہا۔

”لو میاں کچھوے، اب درخت پر اور کوئی پھل نہیں۔ اور میرا پیٹ بھی بھر گیا ہے۔ اب اگلے سال کے لیے تیّاری کرو۔ جب درخت پر کیلے لگیں گے میں پھر کھانے کے لئے آجاؤں گا۔“

”تم پھر اِدھر آنے کا نام بھی نہ لوگے۔ اور اگر آ گئے تو میرا نام کچھوا نہ رکھنا، بندر رکھ دینا۔“ کچھوے نے جواب دیا۔

بندر کو اپنی ہتک پر بے حد غصّہ آیا۔ اور وہ کچھوے سے طاقت ور بھی تو تھا۔ اُس نے کہا۔

”ٹھہرو بد تمیز کچھوے۔ میں تُم سے بدلہ لیتا ہاں۔ بھاگنا مت۔ یہیں رہنا۔“

یہ کہہ کر غصّے کے عالم میں بندر نے درخت سے چھلانگ لگا دی۔

مگر بچّو! تمہیں تو معلوم ہے کہ درخت کے نیچے کچھوے نے کانٹے اور شاخیں بچھا دی تھیں۔ جن سے لمبے لمبے کانٹے لگے ہوئے تھے۔ جُونہی بندر نے چھلانگ ماری، زمین سے لگے وہ سبھی کانٹے اُس کے پاؤں میں داخل ہو گئے۔ تکلیف سے بندر زمین پر لوٹنے لگا۔ مگر زمین پر ہر طرف کانٹے ہی کانٹے تھے۔ بندر کے جسم میں بے شمار کانٹے داخل ہو سکتے۔ اور وہ تکلیف سے بلبلانے لگا۔ ساتھ ساتھ وہ

کچھوے کو گالیاں بھی دیتا رہا تھا۔ اُس کے جسم سے خون بہنے لگا۔ اور کچھوا ایک سمت کھڑا مُسکراتا رہا۔

بڑی مشکل سے بندر نے جسم سے کانٹے نکالے۔ مگر اُس کا جسم لہولہان ہو گیا تھا۔ اور جا بجا خون بہہ رہا تھا۔ اچانک اُسے کچھوے کا خیال آیا۔ وہ ایک جھاڑی میں چھُپا ہوا تھا۔ اس نے کہا۔

بے وقوف کچھوے، تم نے مُجھ سے اچھّا سلوک نہیں کیا۔ میں تم سے بدلہ لینے آ رہا ہوں۔"

یہ کہ کر اُس نے ارد گرد کچھوے کو تلاش کرنا شروع کر دیا۔ اور جلد ہی اُس نے کچھوے کو تلاش کر لیا۔ کمزور کچھوا بے چارہ خوف سے تھر تھر کانپ رہا تھا۔ بندر نے اُس سے دھوکہ بھی کیا تھا۔ اور اب اُسے سزا بھی دینے پر تُلا ہوا تھا۔ اُس نے کہا۔

”دیکھو میاں بندر، تُم نے میرا پھل کھالیا اور میری سال بھر کی محنت کا صلہ بھی مُجھے نہ دیا۔ اور اب مُجھے سزا دینا چاہتے ہو۔“

مگر کم عقل بندر ایسی باتیں سُننے کا عادی کہاں تھا؟ اُس کے تو سارے جسم میں بے شمار کانٹے چُبھے ہوئے تھے اور وہ بے حد تکلیف میں تھا۔ چنانچہ اُس نے کچھوے کو اُٹھا لیا اور سر سے بُلند کر کے کہا۔

”اب بتاؤ تُم سے کیا سلوک کروں؟“

کچھوے نے سوچا اب یقیناً یہ مُجھے مار دے گا۔ اگر اِس نے مُجھے زور سے زمین پر پھینک دیا تو میری کھوپڑی ٹوٹ جائے گی اور پھر میرا زندہ رہنا ناممُکن ہو جائے گا۔ لہٰذا اُس نے کہا۔

”کوئی ایسی صورت نہیں ہو سکتی کہ ہم آپس میں صلح کر لیں اور آرام سے رہیں۔“

”نہیں۔“ بندر نے کہا۔

”میں کیلے کا یہ درخت تمہیں دے سکتا ہوں۔“ کچھوے نے جواب دیا۔ ”شرط یہی ہے کہ مُجھے کُچھ نہ کہو۔“

”نہیں۔ مُجھے یہ بھی منظور نہیں۔“ بندر نے جواب دیا۔ ”یہ درخت تو تمہارا ہی ہے۔ مگر اِس کا پھل تُم نہیں کھا سکتے۔ یہ تو ہر سال اب میں ہی کھایا کروں گا۔“

اب کچھوے نے سوچا، بندر سے چالاکی کے سوا کام نہیں چلے گا۔ چنانچہ اُس نے کہا۔

”میاں بندر، اب تم مُجھے مار تو دو گے ہی۔ مرنے سے پہلے اتنی مہلت تو دے دو کہ میں دریا سے پانی پی لوں۔“

کچھوے کا خیال تھا کہ جب وہ دریا کے کنارے جائے گا تو اُس میں چھلانگ لگا دے گا۔ کیونکہ وہ پانی کا جانور ہے۔ جبکہ بندر خُشکی کا جانور ہے۔ اور اِس طرح

بندر دریا میں جا کر اُسے پکڑ نہ سکے گا اور وہ بچ جائے گا۔

مگر بندر بھی ہوشیار تھا۔ اُس نے کہا۔

"نہیں۔ میں تمہیں کوئی مہلت نہیں دے سکتا۔ تم بتاؤ کہ زمین سے ٹکرا کر مرنا پسند کرو گے یا دریا میں ڈوب کر۔" کچھوا ایک دم خُوش ہو گیا۔ اگر بندر اُسے دریا میں پھینک سے تو وہ ڈوب نہیں سکتا تھا۔ اور بندر کا خیال تھا کہ وہ دریا میں ڈوب جائے گا۔ چنانچہ وہ رو پڑا اور کہا۔

"خُدا کے لیے میاں بندر مُجھے دریا میں نہ پھینکو، کیونکہ میں دریا میں زیادہ تکلیف سے مروں گا۔"

"ہاہاہا۔" بندر نے قہقہہ لگایا۔ "میں تمہیں سسکا سسکا کر مارنا چاہتا ہوں۔ اور دریا میں تُم ڈبکیاں کھا کھا کر زیادہ دیر سے مرو گے۔ چنانچہ میں تمہیں دریا میں پھینکوں گا۔ لو اب تیّار ہو جاؤ۔"

”رحم رحم۔“ کچھوے نے التجا کی۔

مگر بندر کے دِل میں تو انتقام کی آگ جل رہی تھی جو صرف کچھوے کو مار کر بُجھ سکتی تھی۔ چنانچہ اُس نے کچھوے کو اوپر اٹھایا اور دریا میں پھینک دیا۔

بندر کا خیال تھا کہ کچھوا ڈوب جائے گا۔ مگر دریا میں جا کر اپنا سر پانی سے باہر نکالا اور کہا۔

”شکریہ میاں بندر، میں یہاں زیادہ اطمینان سے رہوں گا۔ کیونکہ میں پانی کا جانور ہوں۔“ اور پانی میں مزے سے تیرنے لگا۔

بندر نے جب کچھوے کو صحیح سلامت دیکھا تو اس کے تن بدن میں آگ لگ گئی۔ اُس نے ایک پتھّر اُٹھا کر کچھوے کو دے مارا مگر کچھوا پانی میں ڈُبکی لگا گیا۔ اور دوسری جگہ نکل کر کہا۔

”میاں بندر اب یہاں بیٹھ کر کنکر اور پتھّر چلاؤ۔ جب تھک جاؤ گے تو واپس چلے

جانا۔"

بندر شرمندہ ہو کر واپس چلا گیا اور پھر کبھی اُدھر کا رُخ نہ کیا۔

کچھوے نے پھر درخت کی رکھوالی کرنا شروع کر دی تاکہ اگلی فصل پر اپنے درخت کے کیلے کھا سکے۔

ختم شد